© rasailojaraid.com

نظرات

اُردو زبان کے بارے میں، سیاسی جدوجہد اور آزادی کی تحریک کے زمانے ہی سے سیاستدانوں کا ذہن صاف نہیں تھا، اس لئے اس زبان کے مستقبل پر تاریکیوں کا سایہ آزادی سے پہلے ہی پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ اس خیال کی تاریخی شہادتیں موجود ہیں کہ بیسویں صدی کے آغاز سے بھی پہلے ہندوستان کی متحدہ قومیت کے تصور کو توڑنے کے لئے، انگریزوں نے زبان کے تنازعہ کو ایک موثر حربے کی حیثیت سے استعمال کرنے کا منصوبہ مکمل کر لیا تھا اور اُردو کے مقابلہ پر دیوناگری ہندی کو اس حالت میں کھڑا کرنا شروع کر دیا تھا، جس کی ادبی بساط ان دو تین کتابوں سے زیادہ نہیں تھی، جنہیں فورٹ ولیم میں منصۂ شہود پر لایا گیا تھا اس طرح ہندی کے وجود، اور اس کے جواز کو مصنوعی دلائل سے آراستہ کرنے کا آغاز ہوا تو سر سید جیسے قوم پرست رہنما اور انگریزوں کے خیر خواہ تک پہلے حیرت [illegible] میں پڑ گئے، اور بالآخر اس خطرے سے لرزہ براندام نظر آنے لگے، جو آگے چل کر ہندو مسلم سیاست کو الگ سمتوں میں لے جانے کے لئے اپنے پر تولنے لگا تھا۔ انھوں نے ہر طرح اور ہر جتن کے ذریعہ انگریز حکمرانوں کو زبان کے معاملے میں معقولیت کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی اور بالآخر مایوس ہو کر اعلان کر دیا کہ ہندی اور اُردو کا جھگڑا، بالآخر دونوں فرقوں — ہندو اور مسلمانوں کو فرقہ بندی کی بنیاد پر الگ کر دے گا۔ اس طرح وہ آدمی جو ہندو اور مسلمان قوموں کو اپنی دو آنکھوں کے برابر سمجھنے کا دعویٰ کرتا رہا تھا، اگر آخر عمر میں صرف مسلمانوں کے مستقبل کے تحفظ کی فکر میں غلطاں نظر آنے لگا تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی ذہنی تبدیلی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں ہندی اُردو کے تنازعہ اور اس تنازعہ کے خوفناک نتائج کے سوا کسی دوسرے محرک کا دخل نہیں تھا۔

پھر یہ ہوا کہ جوں جوں ہندوستان آزادی کی طرف بڑھتا گیا، ہندی اُردو کے تنازعہ میں بھی شدت پیدا ہوتی گئی، اور بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک آتے آتے یہ مسئلہ، ان لاینحل سیاسی مسائل کی فہرست میں شامل ہوگیا، جو ہندو مسلم سیاست میں پہلی اہمیت کے تصفیہ طلب مسائل سمجھے جاتے تھے۔ اس سلسلہ میں یہ عجیب غریب بات، سیاست کے طالب علموں اور سیاست کے ماہروں کے لئے یکساں طور پر غور طلب سمجھی جائے گی کہ اگرچہ اُردو زبان شمالی ہندوستان، خاص طور پر دہلی، پنجاب، یوپی، بہار اور مدھیہ پردیش راجستھان کے کچھ مخصوص علاقوں کی، عام بول چال اور تحریر و تقریر کی زبان تھی، جس کے حلقہ میں ہندو اور مسلمان کا کوئی امتیاز نہ تھا لیکن ہندی کی حمایت میں پیش پیش وہ لوگ تھے، جن کا کوئی تعلق ہندی زبان سے نہیں تھا، مثال کے طور پر گاندھی جی اور سبھاش چندر بوس، اور ان سے پہلے تلک اور گوکھلے، میں سے کوئی بھی شمالی ہندوستان کا باشندہ نہیں تھا، اور بالترتیب گجرات، بنگال اور مہاراشٹر کے ان علاقوں سے تعلق رکھتے تھے، جن کے لئے ہندی اور اُردو دونوں زبانیں، اجنبیت اور غیریت کے لحاظ سے یکساں تھیں، یہاں اس بات کو بھی تنقیح کے لئے سامنے رکھنے کی ضرورت ہے کہ مایۂ ناز رہنماؤں نے ہندی کی حمایت ایسی صلاحیت، دانش مندی اور قوت کے ساتھ کی کہ وہ زبان جسے بالاتفاق شاعری کے لئے ناموزوں، اور ادبی سرمایہ کے لحاظ سے تہی دست، اور عمر کے لحاظ سے نوخیز، سمجھا جاتا تھا، اس زبانِ اُردو کی ہم سر، بلکہ تفوق کی دعویدار سمجھی جانے لگی، جدوجہدِ آزادی کے عروج کے ساتھ ہندی اُردو تنازعہ بھی اپنے ایسے عروج پر پہنچا کہ اُردو والے حملے کی شدت سے گھبرا کر پیچھے ہٹے اور ایک ایسی تیسری زبان کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے جس کی تحریر میں استعمال کئے جانے والے عربی فارسی، اور سنسکرت کے الفاظ کا تناسب، ایک باقاعدہ معاہدہ کے ذریعہ طے ہوا، جس پر طویل مذاکرات اور بحث و مباحثہ کے بعد کارروائی کی اُردو وفد کے لیڈر کی حیثیت سے ڈاکٹر عبدالحق، اور ہندی وفد کے لیڈر کی حیثیت سے ڈاکٹر راجندر پرشاد نے دستخط کئے۔ اور اس کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بعد جن لوگوں نے اس تیسری زبان جس کا نام ہندوستانی تجویز ہوا تھا، نمونہ کی تحریریں اخبارات اور ریڈیو کے ذریعہ پیش کیں، ان میں مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین خاں بھی تھے۔

ہندی اور اُردو کے ناموں کو چھوڑ کر ایک تیسری زبان ہندوستانی کو ایک قومی زبان کی حیثیت سے اختیار کرنے کے معاہدہ کی جس ایک آدمی نے آخر تک پابندی کی، وہ خود گاندھی جی تھے، جن کی عقابی نظروں سے یہ مخفی حقیقت پوشیدہ نہیں تھی کہ اس سے آگے کا مرحلہ جارحیت کا ہے اور ہندی اُردو تنازعہ کو جارحیت کے حوالے کرنے کا مطلب قومی اتحاد کو لسانی تفرقہ کے شہر کے سامنے چھوڑ دینے کے برابر خطرناک ثابت ہو سکتا ہے، لیکن ان کے بعد جن لوگوں پر ہندوستانی زبان کو — یعنی گاندھی جی کے الفاظ میں اس زبان کو، جو اردو اور ہندی لپیوں (رسم الخط) میں لکھی جائے — قائم رکھنے کی ذمہ داری آئی، وہ گاندھی جی سے کہیں زیادہ ہندی کے حامی، لیکن ان سے کہیں کم دور اندیش اور دانش مند تھے اس لئے انھوں نے آزادی کے فوراً بعد، ہندوستانی زبان کے معاہدہ کو بالائے طاق رکھ کر، ہندی زبان کو سرکاری اور قومی زبان بنانے کا اٹل موقف اختیار کر لیا۔ اور معاہدہ کی خلاف ورزی کرنے والوں میں سب سے ممتاز شخصیت معاہدہ کے مصنف ڈاکٹر راجندر پرشاد کی تھی جنہوں نے دستور ساز اسمبلی کے صدر کی حیثیت سے اس ہندی کو سرکاری زبان بنانے کے حق میں ووٹ دیا، جو صرف دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔

تقسیم ملک کے بعد جو لوگ لسانی جارحیت کے علمبردار کی حیثیت سے ہندی کی ترویج بلکہ ملک گیر تسلط کی حمایت میں آگے آئے، ان میں سیٹھ گووند داس، پرشوتم داس ٹنڈن، اور ڈاکٹر سمپورنانند کا نام ڈاکٹر راجندر پرشاد کے بعد آتا ہے، اور یہ چاروں ممالک متوسطہ (اب مدھیہ پردیش) اُتر پردیش اور بہار کی تین ریاستوں سے تعلق رکھتے تھے، اس لئے یہ کوئی غیر متوقع اور حیرت انگیز بات نہیں سمجھی جانی چاہئے اگر ان کے شخصی، ذہنی، اور جذباتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اثرات کی بدولت، اتر پردیش، بہار اور مدھیہ پردیش میں اُردو کے خلاف ایک سخت جارحانہ محاذ تیار ہوگیا، جس نے صرف ہندی کو سرکاری زبان بنانے تک اپنے آپ کو محدود نہیں رکھا بلکہ اُردو کے وجود ہی کو ختم کرنے کی ایک ایسی ہمہ گیر مہم چلائی، جس کے تحت بیک جنبشِ قلم، اُردو کی تعلیم پر مکمل پابندی لگادی گئی، سرکاری، اور نیم سرکاری دفتروں سے اُردو کو خارج کردیا گیا، اور سرکاری ملازموں کو چھ مہینے کے اندر ہندی سیکھ کر اس میں کام کاج کرنے یا ملازمتوں سے ہاتھ دھو لینے کے جبری احکامات سُنادئے گئے۔ اور زبردستی کا یہ عمل اگرچہ جمہوری نظام اور جمہوری اصولوں کے خلاف اور فاشیت اور نازیت کے فلسفے کی یاد دلاتے والا تھا لیکن ہندوستان کے جمہوری نظام نے نہ صرف اس عمل کو برداشت کیا بلکہ شمالی ہندوستان میں تو ایک ایسی زبان کو جسے ہندوستان کی متحدہ قومیت اور ہندو اور مسلمانوں کے مشترکہ کوششوں نے جنم دیا تھا اور پروان چڑھایا تھا، نیست و نابود کرنے کی اس کوشش اور ان اقدامات کی مکمل تائید کی بلکہ خیر مقدم کا ہمہ گیر مظاہرہ بھی کیا گیا، جو سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر خالص فرقہ وارانہ ذہن کے تحت بروئے کار لائے جارہے تھے۔ ایک جیتی جاگتی، مقبول عام اور خوبصورت زبان کو ختم کرنے کا کوئی اخلاقی جواز، اور جڑ سے اُکھاڑ دینے کی کوئی قانونی اور دستوری گنجائش موجود نہیں تھی، اس لئے اُردو کے خلاف ایسے پروپگنڈے اور ایسے مخالفانہ دلائل سے کام لیا گیا، جو سراسر مصنوعی تاریخی اعتبار سے غلط اور مکمل طور پر بے بنیاد تھے مثال کے طور پر کہا گیا — کہ اُردو ہندی کی ہی ایک شیلی (اسلوب) ہے، اور اس کا الگ سے کوئی وجود نہیں ہے، اور اُردو غیر ملکی زبان ہے اور یہ کہ اردو ایک ایسی زبان ہے جو علیحدگی اور تفرقہ کو پیدا کرتی ہے اور ملک کی تقسیم کی ذمہ دار ہے، اور منگولوں، حملہ آوروں اور وحشیوں کی زبان ہے، اور غیر ملکی حکومت کی ایک ایسی بدنما یادگار ہے، جس کا آزاد ہندوستان میں باقی رہنا، قومی مفاد کے لئے خطرناک ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ظاہر ہے کہ ان الزامات میں سے کوئی ایک الزام بھی تاریخی اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔ اور زور زبردستی، اور حکومت کی بے پناہ آمریت، اُردو کو نیست و نابود کرکے اس کی جگہ ایک مصنوعی زبان ہندی کا تسلط قائم کرنے کے جذبہ اور مقصد کے علاوہ ان الزامات کی کوئی حقیقی اور منطقی بنیاد موجود نہیں ہے —— جیسا کہ ایک مشہور ہندو دانشور مدرا۔ راکھشس نے اپنے ایک حالیہ مضمون میں کہا ہے :۔

"کھڑی بولی (ہندی) کے بارے میں آج بھی یونیورسٹیوں کے ہندی نصاب میں پڑھایا جاتا ہے، پون صدی قبل شاعری نہیں کی جا سکتی تھی، اُردو کی بڑی بہن کیسے قرار دی جا سکتی ہے، جس میں ڈیڑھ سو برس پہلے بھی اعلیٰ درجہ کی شاعری ہو رہی تھی۔ —— حقیقت یہ ہے کہ اُردو نہیں —— موجودہ کھڑی بولی ہندی ہے، جسے اُردو کی شیلی (اسلوب) قرار دیا جا سکتا ہے۔"

(ہندی روزنامہ امرت پربھات)

مدرا راکھشس نے ہندی کے مورخ ڈاکٹر دھریندر ورما کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان کی ہندی کی تاریخ —— آج بھی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جا رہی ہے اور اس میں وہ صاف طور پر لکھتے ہیں کہ :۔

"اٹھارویں صدی میں برج بھاشا کا اثر کم ہو چکا تھا ساتھ ہی مسلمانوں میں (ہندو مسلمانوں میں ؟) کھڑی بولی اُردو زور پکڑ چکی تھی۔ اُنیسویں صدی کی ابتدا میں، انگریزوں نے ہندوؤں کے لئے کھڑی بولی کے اسلوب میں کچھ تجربے کرائے ان تجربات کے سلسلے میں ہی فورٹ ولیم کالج میں للو (لال جی) پرشاد نے پریم ساگر اور سدل مشر نے (نا سکتے تو پاکھیان کی تخلیق کی۔ دھیان دینے کی بات ہے کہ جب اُردو زور پکڑ چکی تھی تو ہندی کے لئے (ابتدائی) تجربات ہو رہے تھے اس لئے ہندی کے لئے لڑنے والوں کو یہ کہنا چھوڑ دینا چاہئے کہ اُردو کوئی الگ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زبان نہیں ہے یا پھر یہ کہ وہ ہندی کی چھوٹی بہن یا شیلی ہے۔"

جہاں تک دوسرے الزامات کا سوال ہے یعنی اُردو کے غیر ملکی ہونے کا الزام — تو اس سے زیادہ لچر اور بے بنیاد الزام کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ الزام لگانے والے لوگوں میں کوئی ایک بھی یہ بات ثابت نہیں کر سکتا کہ اُردو برِ صغیر کے علاوہ، کس ملک کی زبان ہے، اور ہند و پاکستان کے علاوہ اور کس ملک میں بولی جاتی ہے۔ جہاں تک منگولوں، حملہ آوروں، اور مغلوں کی زبان کو اُردو قرار دینے کا سوال ہے تو اس بے بنیاد بات کو کہہ کر ہندی کے حامی، تاریخ کے لئے اپنی بے شعوری اور ناواقفیت کے سوا کسی دوسری چیز کا مظاہرہ نہیں کرتے جو اس حقیقت کو غیر مشکوک طور پر ثابت کرتی ہے کہ شہاب الدین غوری سے لے کر ابراہیم لودی تک ان کے دائرۂ اقتدار میں آنے والے ملک کی سرکاری اور عوامی زبان فارسی رہی ہے، اور مغل حکمران ظہیر الدین بابر سے لے کر محمد شاہ تک (۱۷۳۱ء) تک ترکی زبان تحریر اور تقریر کے لئے استعمال کرتے رہے، یہاں تک محمد شاہ ایک ایسا بادشاہ مغل تخت پر بیٹھا جو ترکی زبان سے بالکل ناواقف تھا۔ اسی لئے اس کے زمانے میں کہا گیا کہ — درعہدِ محمد شاہ ترکی تمام شد —

جہاں تک کسی زبان پر علیحدگی پسندی اور تفرقہ اندوزی کے الزام کا سوال ہے، یہ بات صرف وہی لوگ کہہ سکتے ہیں جو سماجی عمل کے انداز اور فطرت سے بے بہرہ ہیں، اور جو اس بات سے واقف نہیں کہ زبانیں تفرقہ انگیزی اور علیحدگی پسندی کا مزاج نہیں رکھتی ہیں بلکہ انھیں استعمال کرنے والے آدمی ہوتے ہیں جو زبانوں کو محبت، نفرت، علیحدگی پسندی، اتحاد، تفرقہ انگیزی اور علیحدگی پسندی کے جذبات پھیلانے کے لئے استعمال کیا ہو، جیسا کہ پنجاب میں ہندی اور پنجابی کے حامیوں نے اپنے جھگڑوں کے لئے اُردو کا استعمال کیا اور ایک دوسرے کے خلاف منافرت پھیلانے میں اس زبان کو اپنا ذریعہ بنایا — اور اسی طرح — جس طرح آج ہندی کے حامی ہندی زبان کو ایک سامراجی ہتھیار کے بطور استعمال کر رہے ہیں، جس کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خلاف جنوب کی ریاستوں، تامل ناڈو، آندھرا پردیش، کرناٹک، اور کیرالا کے علاوہ بنگال اور مہاراشٹر نے بھی علمِ بغاوت بلند کر دیا ہے۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد، سیٹھ گووند داس، پرشوتم داس ٹنڈن اور ڈاکٹر سمپورنا نند نے ہندی تسلط کو یقینی بنانے کے لئے اردو زبان کے چلن کو تو مسدود و محدود کرنے میں یقیناً کامیابی حاصل کرلی، لیکن ہندوستان کے قومی ڈھانچہ کو ایسی لسانی کشمکش سے بھی دوچار کر دیا کہ ہندی زبان اپنی ملک گیر حیثیت اور رابطہ کی زبان بننے کے بھی امکانات سے محروم ہو کر ایک علاقائی زبان کی حیثیت پر اکتفا کرنے پر مجبور ہو گئی ہے اور آہستہ آہستہ ایک ایسی صورتِ حال تک پہنچ گئی ہے کہ یوپی، بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان اور ہریانہ کے سوا کوئی ریاست اسے قومی زبان تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔

© rasailojaraid.com